R. No. 2186/57

Regd. No. L. 977.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

ٹیلی فون - ۶۹
قیمت [illegible] پیسہ
[illegible] صفحے

جلد ۲۴ - شمارہ ۴۲ | ایڈیٹر:- آل احمد سرور | ۸ نومبر ۱۹۶۵ء

اداریہ

اپنی طاقت کو پہچانیے

پاکستان نے کشمیر کی سرحد میں مداخلت کار بھیج کر ہندوستان کے خلاف جارحانہ کارروائی کی اور جب وہاں کی آبادی کو بغاوت پر آمادہ نہ کر سکا تو چھمب کے علاقے میں بین الاقوامی سرحد پار کر کے بڑے زور کا حملہ کیا ہماری فوجوں نے نہ صرف اس حملے کو روک دیا بلکہ دفاعی کارروائی کے طور پر لاہور اور سیالکوٹ کی طرف رخ کیا اور بہت جلد پاکستان کو معلوم ہو گیا کہ امریکہ کی فوجی امداد کے باوجود اس کی ہر چال ناکام ہوئی اور لڑائی کا میدان بجائے ہندوستان کی سرزمین کے پاکستان کی سرزمین پر منتقل ہو گیا۔ ہمارا ارادہ کسی وقت پاکستان کے علاقے پر قبضہ کرنے کا نہ تھا مگر پاکستان کی چالوں کو ناکام بنانا اور اسے سبق دینا ضروری تھا۔ اب یو این او کے کہنے سے لڑائی بند ہو گئی ہے مگر پاکستان پروپیگنڈا کیے جا رہا ہے جس کا مقصد دنیا کو عموماً اور پاکستانی آبادی کو خصوصاً یہ دکھانا ہے کہ اگر ہندوستان کے پاس پاکستان کا کچھ علاقہ ہے تو پاکستان کے پاس بھی کچھ نہ کچھ ہندوستان کا علاقہ بھی ہے ہمیں یقین ہے کہ اس معاملے میں بھی پاکستان کو منھ کی کھانی پڑے گی۔

جب یہ جنگ چھڑی ہے تو بہت سے مغربی ملکوں کو ہندوستان اور اس کی جمہوریت اور سیکولرزم کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ ہندوستان پہلے بھی امن پسند تھا اور آج بھی امن پسند ہے۔ ہندوستان کی امن پسندی کے کچھ مغربی طاقتوں نے غلط معنی لیے تھے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ چونکہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور اس کے باسیوں میں بہت سے آپس میں اختلافات ہیں اور چونکہ یہ اختلافات بعض اوقات [illegible] اس لیے اس جنگ میں پاکستان کچھ تو فوجی کامیابی حاصل کرے گا اور کچھ ملک کے اندر انتشار اس کی مدد کرے گا۔ لیکن نہ صرف ہماری فوجوں نے پاکستان کو ہر میدان میں نیچا دکھایا بلکہ ملک کے سب لوگوں نے ایک ایسے اتحاد اور اتفاق اور یک جہتی کا ثبوت دیا جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ دراصل یہ ہندوستان کے جمہوری نظام اور اس کے سیکولر کردار کی فتح ہے۔

اس جمہوری نظام کی مضبوطی اور سیکولر کردار کے فروغ کے سہارے ہم ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت بڑی آبادی ہے۔ فطرت نے ہمیں بے پناہ دولت سے مالا مال کیا ہے، ہمارا ایک شاندار دستور اور ہمارے سامنے انسانیت اور تہذیب کے اعلیٰ اصول ہیں۔ ہم جنگ جو نہیں امن پسند ہیں، مگر کسی کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ ہماری وحدت اور سالمیت پر ذرا سی بھی ضرب لگا سکے ہم کسی کی زمین دبانا نہیں چاہتے، مگر اپنی زمین کا ایک انچ بھی دینا گوارا نہیں کر سکتے۔ ہم دوست ملکوں کی امداد قبول کر سکتے ہیں مگر اس کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم اپنی سیاست اپنی ضروریات اور اپنے مزاج کے مطابق بناتے ہیں، کسی کی مصلحت یا اشارے کی بنا پر نہیں۔ ہم جمہوریت اور سیکولرزم کے سہارے اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ پاکستان کی ناسمجھی، کوتاہ بینی، تنگ نظری اور کج روی کی وجہ سے ہمارے ترقیاتی منصوبوں پر اثر پڑے گا کیونکہ ہمیں دفاعی کاموں پر پوری توجہ کرنی پڑے گی، مگر یہ ترقیاتی منصوبے رکیں گے نہیں کیونکہ ان کی وجہ سے ہی بالآخر ہم اور مضبوط ہوتے ہیں، ہمارا معیار زندگی بڑھتا ہے، ہمارے ملک کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ اب دفاع اور ترقی دونوں کے مطالبات

اس شمارے میں

کو ہر منزل پر ہم آہنگ کرنا پڑے گا۔

اس نازک موقع پر ہم سب کا فرض ہے کہ اپنے اُصولوں اور آدرشوں کی طاقت کو پہچانیں اور دوسروں سے پہچنوائیں۔ روزمرہ کے کاموں میں سیکولرزم اور جمہوریت کے اصولوں کو اور سختی سے نافذ کریں غذا کے سلسلے میں خود کفیل ہونے کی کوشش کریں، دفاعی کاموں میں دامے، درمے، سخنے، قدمے مدد کریں اور روزمرہ کی زندگی کی اس طرح تنظیم کریں کہ مجموعی طور پر ہمارے صوبوں اور ضلعوں سے ملک اور مضبوط اور متحد ہو۔ یہ وقت افراد اور جماعتوں کے ایک دوسرے پر اعتراض کا نہیں ہے۔ سب مل کر ملک کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنے اور اس کو طاقتور بنانے کا ہے۔ اس کام میں ادیب اور شاعر خاص طور پر مدد کرسکتے ہیں۔ ہمیشہ سے وہ انسانیت کو مسرت کے ساتھ بصیرت عطا کرتے رہے ہیں۔ آج انسانیت کی اُن اعلیٰ قدروں کی بصیرت جو ہندستان نے اپنائی ہیں اور گہری اور عام کرنی ہے۔ یقین ہے کہ اردو کے شاعر اور ادیب اور دانشور، جو زندگی کے ہر موڑ پر ذہن کی ذہنی رہنمائی کرتے رہے ہیں، آج کی منزل میں بھی پیش پیش ہوں گے۔ آب حیات پر انھیں کا حق ہوتا ہے جو ہر ظلمات سے گزر سکتے ہیں۔

سیر بین

پہلے تو اس قسم کے واقعات بہت سننے میں آتے تھے کہ جب کسی شوہر کو اپنی بیوی کے چال چلن پر شبہ ہوا، اس نے جھٹ اس کی ناک کاٹ لی۔ وہ ایک نکٹی عورتیں ہم نے بھی دیکھیں اور جب کسی جاننے والے سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ اس کے شوہر کی کارستانی ہے۔ لیکن چند روز ہوئے اخبار میں ایک ایسی خبر دیکھی جس نے ہمیں حیران کردیا۔ ایک میاں نے نہ صرف اپنی بیوی کی ناک کاٹ لی، بلکہ اس ڈر سے کہ کہیں یہ ناک پھر جوڑ نہ دی جائے اسے نوش جان بھی کرگیا۔ ظاہر ہے نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر غریب ناک پر ہی کیوں گر آتا ہے۔ کان، آنکھ، دانت، ہاتھ اور بھی تو اعضا ہیں۔ غالباً شعرا کی قصیدہ خوانی کے باوجود ناک کی اہمیت حسن میں آنکھ سے زیادہ ہے۔ ناک سلامت نہ رہے تو چہرے کی دلکشی تو رخصت ہوتی ہی ہے عزت آبرو پر بھی حرف آتا ہے۔

مسٹر پامپیڈو وزیر اعظم فرانس نے اپنی کابینہ کی بڑی شاندار دعوت کی۔ دعوت اس خوشی میں کی گئی تھی کہ اس وزارت نے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ تین سال چھ مہینے اور اٹھارہ دن سے برسر اقتدار ہے اب تک فرانس میں کوئی کابینہ اتنے عرصے تک نہیں چل سکی تھی۔ اس سے پہلے وزارتیں اتنی تیزی سے بدل رہی تھیں کہ شاید ہی کوئی مزاج بدلتے ہوں کر ساڑھے تین سال سے مسٹر پامپیڈو کی کابینہ ہی کام کر رہی ہے۔ مگر فرانسیسی اتنی سیمابی طبیعت رکھتے ہیں کہ اب جانا اس کابینہ کو بھی چلتا کردیں گے۔ صدر ڈیگال کا بدلنا مشکل ہے مگر وزیر اعظم تو کوڑی کے تین ملتے ہیں۔

لندن میں جشن شاعری

۱۶ ستمبر سے ۲ اکتوبر ۶۵ء تک لندن کے رائل کورٹ تھیٹر میں جشن شاعری منایا گیا۔ یہ جشن "شاعری اور آواز" کے عنوان سے دولت مشترکہ کے فنون لطیفہ کے فیسٹیول کا ایک حصہ تھا۔ اس جشن کے لیے انگریزی کی بیس نظموں کو منتخب کیا گیا۔ یہ نظمیں اور دولت مشترکہ کی شاعری سے متعلق چند مضامین "شاعری اور آواز" کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیے جائیں گے۔ (دی انڈین پی۔ ای۔ این)

پی، ای، این کے نئے اعزازی ممبر اور نائب صدر

پی، ای، این کی مجلس عاملہ نے اپنی ۱۶ اگست ۶۵ء کی میٹنگ میں مندرجہ ذیل حضرات کو اعزازی ممبر نامزد کیا۔

جناب کاکا کالیکر، ڈاکٹر کالی داس ناگ، ڈاکٹر سی، پی، راماسوامی آئیر، ڈاکٹر سونتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر پی، وی کانے اور جناب شنکر کروپ اسی میٹنگ میں مجلس عاملہ نے جناب کے، ایم منشی کو نائب صدر بھی نامزد کیا۔

(دی انڈین پی، ای، این)

"کربل کتھا" شایع ہوگئی

جناب مالک رام اور ڈاکٹر مختارالدین احمد نے فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" ایک فاضلانہ مقدمے، ضروری حواشی اور فرہنگوں کے ساتھ نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کی طرف سے شایع کی ہے۔ اردو میں اس کا صرف ایک نسخہ ڈاکٹر اشپرنگر کے کتب خانہ میں تھا جس کا عکس ڈاکٹر مختارالدین احمد نے حاصل کیا اور اب اسے علمی دنیا کے سامنے مطبوعہ صورت میں پیش کیا ہے۔ تقریباً چار سو صفحات کی یہ کتاب ساڑھے سات روپے میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

(نامہ نگار)

سلطان احمد

بزرگِ دسنہ کی یاد

یہ بزرگ وطن دغریب شہر، غالب شناس اور اقبال شناس، سخن فہم اور زبان داں، تارکِ لذات تھے اور صاحبِ صوم و صلوٰۃ و تبرکات۔ زندگی با ہمہ و بے ہمہ تھی۔ شاید تزکیۂ نفس اور پاکیٔ دامن کا نچوڑ اس میں تھا کہ موت قریب آئے تو عزیز بن جائے۔ خوف ہو نہ ہراس، تبسم ہو اور تسکین۔ یہ نہیں کہ بزرگی کا اقرار اور لغزشوں سے انکار۔ البتہ یہ کہ مرنے سے پہلے موت ذہن نشین ہو گئی اور آخرت سامنے آ گئی۔ مشیت دیسی منتفی، عمل کی جبت بھی یقین کی صورت ہے۔ کہ طاعت سے بہتر ہے ترکِ معاصی۔ بس رات دل کو بھا گئی۔ بوجھ بھاری تھا ہلکا ہو گیا۔ وہ اپنے کیے پر اشکباری کی سکت ہے نہ عذر کی ہمت۔ کسی مجرم کے لیے اس سے زیادہ تقویت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس کے پاس جاتا ہے وہ سب سے بڑا مہربان ہو۔ محض تصور تھا یا کوئی عمل، جس نے موت میں جان ڈالی۔ وہ جتنا ابھرتا اور ظاہر ہوتا گیا، یہ اتنے ہی بیدار اور ہوشیار ہونے لگے۔ شاید انھوں نے اپنے کو پالیا اور بلاشبہ موت نے ان کو۔ زندگی میں کیسے کیسے انقلاب دیکھے۔ ایک دفعہ کہتے تھے جب ہر سانس کسی نہ کسی تغیر کا پیغام ہے۔ تو کیا بتاؤں، ایک صدی کی لگ بھگ مدت کتنے مرحلوں سے گزری۔ دیکھنے والوں کے لیے خود اپنا تغیر ہی کیا کم ہے۔ مگر جو دیکھے نہ سمجھے وہ کیا دیکھے اور کیا سمجھے۔ حکایتیں، نقشے، تاریخ، قصیدے، افعال ظاہر ہیں کردار نظر بند، بس دیدۂ حیراں اور نظارۂ عالم۔ حاصل یہی کہ قافلے اٹھے، نعرے بلند ہوئے، نغمے گونجے اور فضاؤں میں گم ہو گئے۔ شمع روشن ہوئی اور بجھ گئی۔ شعلے تڑپتے رہے، شرر نے داد دی۔ انسان کی لطیف و نازک آواز اس کے مرنے اور مٹنے کے بعد بھی سنی اور پہچانی جائے۔ لیکن ٹھوس اور مضبوط جسم جو زمانے کی شدت کا مدتوں مقابلہ کرے۔ اس کا ذرہ ذرہ اگر کائنات کے پردوں میں کہیں محفوظ ہو۔ اور خلق کے بعد امر کی صورتوں میں دوبارہ اٹھ کھڑا ہو۔ تو یقین میں آگے نہ بادہ کیا چاہیے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

سنو! افسانہ جانتا پروردگار۔ گرمیوں کا دن دوپہر کا وقت تھا ایک مزدور جنگل میں لکڑیاں کاٹتے کاٹتے تھک کر چور، پسینوں میں شرابور، کاٹی ہوئی لکڑیوں کا گٹھا اٹھانے اٹھتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتا، اس جنگل بیابان میں کون دکھائی دیتا۔ آخر گھبرا کر بول اٹھا اس جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ نظر آسمان پر لگی تھی اور زبان گویا کہنے لگا "اے موت تو بھی نہیں آتی کہ نجات ملے" ادھر زمین پر ایک تنومند شخص کھڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کا دم گھٹنے لگا، رنگ زرد، چہرہ فق تھا۔ نہایت لرزتی ہوئی آواز میں بولا میرے مہربان ذرا یہ بوجھ اٹھا دو۔ بیچارے مزدور پر کیا منحصر، دوسرے خوش حال اور بلند مقام بھی جو مصیبتوں میں موت کو پکارتے ہیں۔ وہ ہرگز موت کے خواہاں نہیں، صرف اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ یہ موت کو بلانا ہے یا اس سے بھاگنا۔ یاد کی بھول ہو بھول کی یاد نہیں۔ بھول کے یاد آنے اور یاد کے بھول جانے میں فرق ہے۔ وہم کی شکل ہی نہیں گریز کی صورت بھی مشتبہ ہوتی ہے۔ موت کی آرزو بڑی بات ہے۔ یہاں اس کا یقین ہی کتنوں کو ہے۔ خواہ مرتے ہوئے دیکھیں، اپنے ہاتھوں سے دفن بھی کریں۔ مگر خود یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے مریں وہ تھوڑے ہی مرنے والے ہیں۔ اور اگر مرنا ہی پڑے تو ابھی بہت دن ہیں۔ جیسے انھیں اپنے مرنے کا دن اور وقت معلوم ہے۔ تعجب و حیرت کی بات ہے کہ جس امر کا پورا علم ہو اس سے یہ غافل، اور جس سے بالکل غافل ہو اس کے علم کا دعویٰ ہی نہیں اس پر بھروسہ بھی۔ علم دولت ہے اور طاقت، استعمال مفید ہے اور مضر بھی۔ علم کی تن پروری کی فساد ہے اور جان پروری کشادگی و سکون۔

مولوی بشیر الحق ایک مرنجان مرنج بزرگ تھے۔ دسنہ کے رہنے والے عظیم آباد کے گنجِ سعیدن محلے میں مدتوں مقیم رہے۔ گرد و پیش گنجان آبادی کا شور ہنگامہ، اور وہ اپنے گوشۂ عافیت میں مطمئن و پرسکون۔ مسجد کے قاضی نہ تہذیب کے رنگ، سیدھی سادھی زندگی معمولات کی پابند اور معلومات کی گرویدہ۔ میری ان کی ملاقات درمیان سے ہوئی۔ وہ اپنی طویل ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے شغلِ مطالعہ میں منہمک۔ ادھر ادھر آتے جاتے ایک دوسرے سے ملتے۔ وہ سیاسی ہنگاموں سے الگ تھلگ ہی دور ہوں، معلومات کی حد تک قریب قریب تھے۔ میرے لیے تفریح کی یہ صورت اچھی تھی۔ رفتہ رفتہ ملاقات کا سلسلہ بڑھا، پھر گرمی اور زندگی آئی۔ وہ مجلسی گفتگو میں زیادہ شگفتہ ہوتے اور پرانی صحبتوں کی یاد میں باغ و بہار۔ ان کے ابتدائی حالات معلوم نہیں، کبھی بیان ہوئے نہ کسی نے قلمبند کیے۔ البتہ سرسری طور پر کوئی ذکر آ جاتا جس سے بعض افراد و احوال کا پتہ چلتا۔ مثلاً شیر بنگال فضل الحق، مسٹر سید حسین، مشہور صحافی و سیاست داں مسٹر احمد سہیر کلکتہ شب اور الحاج محمد یونس بیرسٹر کی رفاقتیں اور معاصرانہ سرگرمیوں کا تذکرہ، یا جریدۂ الپنچ بانکی پور پٹنہ کی روداد، مولوی رحیم الدین، علامہ فضل حق آزاد، نواب سید محمد اور عبد الغفور شہباز کی صحبتوں سے وابستہ رہی۔ دلوں کی گرمی بڑھاتی اور زندگی کا ثبوت دیتی۔ اس عہد کی داستان بیان کرتے ہوئے ان کے جسم کی تھرتھری اور چہرے کی رونق دیکھنے کی تھی۔ میں ان کی ہاں ہاں میں کسی قدر بے تکلف تھا چنانچہ ان کے خط پر بیں کو چھپا رکھنے سے میں انھیں "داروغۂ اردو" کے لقب سے یاد کرتا۔ میری یہ جسارت ان کو پسند تھی یا ناپسند انھوں نے منع کیا

نہ باز رکھا۔ لیکن ان دو لفظوں میں ان کی طویل زندگی سمٹ آئی۔ ابتدا پولیس کی ملازمت، انتہا اردو کی خدمت۔ وہ خاموش و دیر آشنا تھے، محنتی و جفاکش۔ اقدام میں رواں، ہنگاموں سے گریزاں، مبالغوں سے دور اور مباحثوں سے مجتنب۔ بس سوال کرو اور جواب پاؤ، کم نہ زیادہ، قل و دل۔

آفتاب نکلے اور ڈوبے، موسم آئے اور جائے، فضا خوشگوار ہو یا مکدر، ان کے اوقات میں خلل نہیں۔ زبان کے رسیا تھے رسائل کے سودائی۔ اور کتابوں کے گرد چرگرد ساری زندگی تلاش و جستجو کرتے رہے۔ صبح ہوئی اور نکل پڑے شام ہوئی اور جا بیٹھے۔ ہاتھ کبھی خالی نہیں، یہ رسالہ ہے وہ اخبار، سامنے جو بھی آیا اٹھا کر دیکھنا ضروری تھا۔ خواہ بچوں کا قاعدہ بغدادی ہو، کچھ نہیں تو کتبہ کا نام، اشاعت کی تعداد اور سن طباعت ہی ڈھونڈ لیں۔ اور کتاب مل جائے تو مطالعہ میں غرق ہو جائیں۔ کوئی آئے کوئی جائے، شور مچے ہنگامہ ہو، ان کو کسی سے مطلب نہیں۔ صرف وقت سے مجبور ہو کر انھیں پھر بیٹھے اور پورا کریں۔ عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری۔ زندگی کا قافلہ اسی شہر میں لٹا۔ جسم کا زور، طبیعت کا اعتدال، مزاج کا بانکپن سبھی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ایک مضبوط کینڈے دہرے بدن اور پھرتیلے جسم کی ضعیفی کہنگی اور سال خوردگی کا یہ حال کہ ڈھانچہ ڈھیلا ہو کر لڑکھڑائے، وزن گھٹ کر ہوا میں اڑے اور تیز گام چیونٹی کی چال چلے، پھر بھی وضعداری دیکھو، پیکر ناتواں کی بے رنگ و روغن تصویر چلتی پھرتی نظر آئے۔ دیکھنے والے سراسیمہ ہوں کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہو رہا تھا، اور وہ مطمئن ایسے گویا مرنے سے پہلے مر چکے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

زندگی دم لے، موت گھڑیاں گنے۔ یہ آگے بڑھے نہ وہ پیچھے ہٹے۔ وقت مقرر ساعت معین، دیر ہے نہ سویر۔ گھڑی آئی اور چلنا پڑے۔ کوئی ہوشیار ہو یا غافل، زمانہ گردش میں ہے۔ اس سیل رواں میں سب بہتے ہیں۔ اور حرکت کو زندگی اور وسعت کو مقام سمجھتے ہیں۔ لیکن وقت تلوار ہے، اور واقعہ اس کی شہادت اور تسلسل کی رفتار میں روانی کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی کی جلوہ گری میں وہ کونسا رخ ہے جس کا ہر اشارہ پیام رخصت اور تازیانۂ عبرت نہ ہو۔ یہاں تمکین پوش اور جلوۂ تماشا کی کوئی گھڑی ایسی بھی ہے جو صدمۂ رحلت اور داغ مفارقت سے خالی ہو۔ زندگی جیسی بھی گزرے، اگر موت سے غافل نہ ہو تو ندامت کا موقع ہے اور مغفرت کی توقع۔ مدت جتنی قریب مہلت اتنی کم ہو کہ ندامت کی ایک آن بھی غفلت کی مدتوں پر بھاری ہے۔ یاد رہے شدت بڑھے اور ہوشیاری گوارا کرے۔ بے خبری میں ایک تجلی سی آ کر لرزا دے اور خبرداری سخت سے سخت دھکا بھی برداشت کرے۔ کیونکہ حواس کی قوتیں مدافعت کرتی ہیں۔ حواس کی خصوصیتوں میں باہمی ربط ہے اور جسم کے اعضا ایک دوسرے کے معاون و مددگار۔ نظر کو سنتے ہوئے کسی نے دیکھا؟ مگر نظر سے سارے احساس ایک ساتھ جاگ اٹھیں۔ بطور آزمائش ایک ہاتھ سے گھڑا اٹھائے ہوئے اوپر نل سے پانی لو، گھڑے کے وزن سے ہاتھ نہ ہلنے پڑے، جب بھی بڑھتا ہوا وزن تمہاری نظر کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اب گھڑے کے بھرنے اور وزن کے بڑھ جانے کے باوجود، چونکہ ہاتھ کو نظر کی معاونت حاصل ہے، اس لیے وزن کی افزائش اور تھکن کی کسر کبھی مزاحم نہیں بلکہ نظر کے سہارے برداشت کی قوت بڑھ گئی۔ نظر کا جو حال ہے خبر کی وہ صورت، حوصلہ مند اور ہمت شکن۔ مگر قوت ارادی مزاج کا اعتدال قائم رکھے۔ لوگ عام طور پر موت کے نام سے گھبراتے ہیں، اس کو منحوس کہتے ہیں۔ کہیں سر چھپانے سے بلا ٹلتی ہے اور آنکھیں بند کر لینے سے دن اندھیرا ہو جاتا ہے۔ جب کہ موت کے خیال سے عمل کی حرکت بڑھ جائے۔ جو اس کو یاد رکھے اور قریب جانے، ظاہر ہے کہ وہ متعدد خیال ہوگا، ہر سانس کو غنیمت سمجھے گا، جو کچھ کرنا ہے اسے جلد سے جلد پورا کرے گا۔ کیا زندگی کی پرمشغولیت نحوست ہے یا سعادت؟ انسان موت کو نہ بھولے تو اس کا جینا بار ہے اور مرنا بھی ؎

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

دن کو رات سے ملانے والی شام کتنی پرلطف و پرکیف ہوتی ہے۔ یہ سہانی شب چند لمحوں کی مہمان، ارمانوں کا دامن پھیلائے، رونقوں کا دروازہ کھولے، شب تخیر لیے اور چل نکلے۔ اس کے برعکس عصر و مغرب کے درمیان قیامت کی وہ گھڑی، جس میں آفتاب ڈوبتا نظر آئے اور دیکھنے والے کو اس طرح چونکائے کہ دم لبوں پر آئے اور کاسۂ عمل کے سب سے اہم سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنی نماز عصر کے ادا کرنے کا خیال ہو، یا پھر شادکامیوں کے وہ عزیز لمحات جو تمدنی برکات نے باہمی ارتباط و اتحاد خیال اور گرمیٔ صحبت کیلئے وقف کر دیے ہیں جنھیں سکون و آرام کی مصلحتوں کا فاصلہ فردوسی کہنا چاہیے۔ ان سب سے قطع نظر [illegible] کو زندگی کی ساری گرمی، ادھر ادھر سے جیسے جوتوں پر رینگنے کے سوا کیا [illegible]۔ چنانچہ جسم سے نڈھال، ضعیفی سے عاجز، اور وہی آنکھوں کی بچی کھچی بینائی روشنی بھی مطالعہ کی نذر کر دینے کیلئے۔ یہ بزرگ کسی گرد خواندگی میں گھس پڑتے، وہ کوئی کتبہ ہو مدرسہ ہو، کتب خانہ ہو، مکان ہو یا دکان، حتیٰ کہ سڑکوں پر بکنے والے اخبار و رسائل کے انبار و ذخیرے بھی چلتے پھرتے مطالعہ کی نظروں سے کیوں بچیں۔ کسی کی نخوت اسے پسند نہ کرے اور کوئی اسے کھلی بازار سمجھے۔ لیکن شوق کی وارفتگیوں میں ڈھونڈنے والوں کا عالم ہی کیا گزرا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی انھیں ڈھیروں اور کباڑیوں سے وہ نادر و نایاب نسخے بھی مل جاتے ہیں جن سے شاندار محلوں اور شاہی کتب خانوں کی زینت بنتی ہے۔ چنانچہ دسنہ لائبریری کے ذخیرے میں بہت سی نایاب کتابیں انھیں بزرگ دسنہ کی عطیہ ہیں۔ اور اب وہ کتب خانہ شرقیہ پٹنہ میں شعبۂ دسنہ کی یادگار ہیں۔ ان سرسری مطالعوں کے علاوہ وہ ہمیشہ پابندی سے ملک کے [illegible] کتب دینی و دانش کدے، مشرقی کتب خانہ خدا بخش، اور سرکاری کتب خانہ اردو کی مستقل نشستوں کا سلسلہ تا عمر قائم رہا۔ رسائل و مطبوعات پر وہ گہری نظر رکھتے تھے کہ اس صدی میں جتنے جرائد و رسائل ملک کے طول و عرض سے نکلے ان سے باخبر ہی نہیں، ان کے احوال و افکار پر حاوی بھی تھے۔ رسائل و مخزن کے متعلق ممکن تھا کوئی امر سرعیہ الاعتقاد مرحوم سے فراموش ہو جاتا۔ مگر دار و مدار اردو سے کوئی پوچھے وہ بتا دیں اور حوالے اور حاشیے بھی پیش کر دیں۔ اس طرح ہماری زبان کے کتنے معرکے سر ہوئے۔ جو ان کی یاد اور مطالعہ کی سند قرار پائے۔ غرض رسائل اردو کی تحقیق میں ان کی ذات ایک زندہ تاریخ تھی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

غزلیں

محسن زیدی

ایسا ہنگامِ سحر تو کبھی دیکھا ہی نہیں
ڈھل چکی رات مگر دن کا اُجالا ہی نہیں
ہو بھی سکتا ہے کہ دنیا ہو بس اک وہمِ خیال
ہم نے دنیا کو اس انداز سے سوچا ہی نہیں
منزلِ شوق میں کتنے ہی مقام آئے تھے
قافلہ اپنی تمناؤں کا ٹھہرا ہی نہیں
جیسے اپنی کوئی ہستی ہی نہ ہو تیرے بغیر
جب سے کھویا ہے تجھے آپ کو پایا ہی نہیں
دل کا اک آخری آنسو تھا جو پلکوں سے گرا
پھر ستارا سرِ مژگاں کوئی چمکا ہی نہیں
ہم کہ اس سوچ میں ہیں وقت جو ٹھہرے تو چلیں
وقت وہ سیلِ رواں ہے کہ ٹھہرتا ہی نہیں
عشق کا راز تری نیم نگاہی سے ملا
ورنہ یہ عقدۂ دشوار تو کھلتا ہی نہیں
سر جھکانے کو جھکا دیں کسی در پر محسنؔ
لٹ چکے سارے ہی سجدے کوئی سجدہ ہی نہیں

سید حرمت الاکرام

لائیں کہاں سے خندۂ گل کا دماغ ہم
سینے پہ لے کر آئے ہیں لالے کا داغ ہم
دیتے ہیں نور و سوزِ محبت کا عقل کو
رکھتے ہیں شمعِ دل سے منور دماغ ہم
کیا کیا دعائیں دیتی ہے گیتی کی تشنگی
چھلکا رہے ہیں فکر و نظر کے ایاغ ہم
درماندگانِ شب سے یہ کہہ دو بڑھے چلیں
روشن کیے ہوئے ہیں دلوں کے چراغ ہم
کیوں مسکرا کے دیکھ رہی ہے ہمیں خزاں
مدت ہوئی اجاڑ چکے اپنا باغ ہم
تاریکیوں کے دشت میں اک کھیل ہی سہی
آؤ جلا جلا کے بجھائیں چراغ ہم
اس روشنی میں ملتی ہے منزل کی رہگذر
پاتے ہیں تجھ کو دیکھ کے اپنا سراغ ہم
حرمت شعورِ غم کا بھی لازم ہے احترام
کیوں زندگی میں ڈھونڈھ رہے ہیں فراغ ہم

اسرار اکبرآبادی

اٹھتی ہے دل میں گرد سی موجِ بلا کے ساتھ ساتھ
دردِ جگر سفر میں ہے آہِ رسا کے ساتھ ساتھ
سلسلۂ دراز غم وسوسہ ہائے بیش و کم
سائے تمام بڑھ چلے شمعِ وفا کے ساتھ ساتھ
حاصلِ دردِ زندگی سوز و گداز بندگی
وقت کا ہاتھ اٹھ گیا میری دعا کے ساتھ ساتھ
آنکھوں میں ہم اتار لیں گیسوئے شب سنوار لیں
جھلکی ہوئی ہے اک کرن کالی گھٹا کے ساتھ ساتھ
نغمۂ دل کشا وہی مہکی ہوئی فضا وہی
سانسیں کسی کی آ گئیں موجِ ہوا کے ساتھ ساتھ
جانِ بہارِ گلستاں حسنِ چمن کی خیر ہو
ڈسنے لگے ہیں بال و پر بادِ صبا کے ساتھ ساتھ
ذوقِ نظر نواز ان کے رخِ جمیل پر
جیسے کہ گل نکل گئے رنگِ حنا کے ساتھ ساتھ

قدیم قلمی نسخوں کا مخزن

ایبا چنکو

ماتنداران میں ۱۰،۰۰۰ قدیم آرمینیائی قلمی نسخے اور کتابیں، تقریباً ۲۰،۰۰۰ قلمی نسخوں کے غیر مکمل حصے اور آرمینیا اور اس کی نواحی ریاستوں کے عوام کی تاریخ سے متعلق ۳۰۰،۰۰۰ تاریخی دستاویزات محفوظ ہیں۔ یہ خزانہ گزشتہ ۱۵۰۰ برسوں میں جمع کیا گیا ہے۔ یہاں وہ سب کچھ محفوظ ہے جو ان بیرونی حملہ آوروں کی دست برد سے بچ سکا جنھوں نے اس قدیم ملک اور اس کے عوام کو محکوم اور غلام بنانے کے لیے کئی بار حملے کیے۔

ماتنداران میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب سا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا پرانے زمانے کے بعد بعض نسل در نسل ہم تک پہنچ رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے موجودہ علم اور تجربہ لوگوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے صدیوں میں جمع کیا ہے۔ یہ کیوں نہ پیدا ہو جب کہ ہزار ہزار سال پرانی بیش قیمت کتابیں اس خزانے میں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں اور سب سے قدیم تحریریں ۵ ویں صدی کی ہیں۔

اس مخزن میں پانچویں اور ساتویں صدی سے متعلق قلمی نسخوں کے پرزے محفوظ ہیں اور ایک عجیب و غریب کتاب "جغرافیہ" بھی ہے جو آرمینیا کے ایک سائنس داں اور مفکر اناشیرا کانسی نے لکھی تھی جس نے ساتویں صدی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ زمین گول ہے اور یہ کہ چاند صرف سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔

ماتنداران کے اس مخزن میں آرمینیا کے فلسفیوں، مورخوں، شاعروں، طبیبوں، کیمیاگروں، ریاضی داں، نجومیوں اور فنکاروں کی تخلیقات جمع ہیں۔ عہدِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے آرمینیائی سائنس دانوں کی کتابوں کے علاوہ اس مخزن میں بہت سی کتابیں غیر ملکی مصنفوں کی بھی ہیں جن کا آرمینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں سے کچھ کتابیں تو انہیں آرمینی ترجموں ہی کی صورت میں دستیاب ہوئی ہیں۔

میں ماتنداران دیکھنے اس وقت گیا تھا جب کہ ہندوستان سے متعلق پرانی کتابوں اور قلمی نسخوں کی نمائش کی گئی تھی۔ اس ذخیرے میں اس طرح کی کتابوں اور نسخوں کی تعداد کافی ہے۔ ان کے مضامین اس بات کا ثبوت ہیں کہ آرمینیا کے لوگ زمانۂ قدیم میں ہندوستان سے واقف تھے اور انھیں اس ملک سے دلچسپی تھی۔

ایک طب کی کتاب میں جس نے مجھے متوجہ کیا، وہ نسخے تھے جن میں سے بیشتر ہندوستانی جڑی بوٹی اور پودوں سے تیار ہوتے تھے۔

نمائش کی ایک عجیب چیز آرمینی زبان کا پہلا رسالہ تھا جو ۱۷۹۴ء میں مدراس سے شائع ہوا تھا۔

کتابیں اتنی زیادہ اہم نہیں بلکہ لوگ اہم ہیں جو نسل در نسل ان کے علم کو محفوظ رکھتے ہیں۔

(سوویت دیس)

ابو خالد سعید انصاری

دولت ہند

(از ہنری فنوک)

فورٹ ولیم کالج کے ارباب نے ہندوستان میں اردو کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترتیب و تراجم کی مفید اور قابل قدر خدمت انجام دی ہیں۔ کالج اور بیرون کالج کے مصنفین کی خدمات سے اردو ادب کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافے ہوئے ہیں۔ اردو ادب کے ان خادموں میں ہندو، مسلمان اور انگریز مصنفین شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر کا ذکر پروفیسر حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں اور رام بابو سکسینہ نے اردو فارسی کے یوروپین شعراء کے تذکرہ میں کیا ہے۔ دیگر حضرات نے بھی اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۸۵۷ء کے پہلے اردو میں ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہو رہی تھیں اور ان میں سے اکثر طبع ہو گئی تھیں ان کتابوں کی ایک مختصر فہرست "داستان تاریخ اردو" میں (صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۸) دی گئی ہے۔ علوم و فنون کی ان کتابوں میں فن زراعت پر مندرجہ ذیل کتب کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) کھیت کرم (۳ حصے) مصنفہ کالی رائے مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء
(۲) توصیف زراعت مرتبہ کلب حسین مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء
(۳) پندنامہ کاشتکاری مصنفہ جوتی لال " پٹنہ ۱۸۵۲ء
(۴) چائے لگانے کی کتاب " لاہور ۱۸۵۳ء
(۵) گنگا کی نہر (فن زراعت کے انگریزی رسالہ کا ترجمہ) مترجمہ سداسکھ لال مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء

اس دور کی فن زراعت پر ایک قدیم مصور کتاب موسوم بہ "دولت ہند" راقم کے پیش نظر ہے جس کا ذکر داستان تاریخ اردو میں نہیں ہے۔ یہ کتاب ایک انگریز مصنف ہنری فنوک کی تالیف ہے۔ سن تالیف ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء ہے۔ کتاب کے سبب تصنیف کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ:

"اگریکلچرل اور ہارٹیکلچرل سوسیٹی" کے اصحاب اقتدار نے اس سرزمین کی بھلائی اور اہل ولایت انگلش کے زراعت کے دستور کو رواج دینے کے لیے ایک کتاب کی تصنیف کا ایما اور اشارہ بذریعہ اشتہار کے فرمایا ہے۔ برطبق اس کے اس خیر خواہ خلائق ہنری فنوک نے اس کتاب کے لکھنے میں تھکا ہمت کا کمر جان پر باندھا اور زبان اردو میں جو ٹھیٹ محاورہ اور بول چال ہے تھوڑے دنوں میں ترتیب دی اور نام دولت ہند رکھا اور توفیق الٰہی سے بیس بابوں پر مرتب کیا۔"

(ص ۲)

اس کتاب پر تقریظ کی شکل میں تین سرٹیفکٹ ہیں۔

پہلا سرٹیفکٹ مرقومہ ۴ رمضان المبارک ۱۲۶۱ھ مفضل الرحمن قاضی صدر کلکتہ کا فارسی زبان میں ہے۔

"نسخہ دولت ہند تالیف مسٹر ہنری فنوک بزبان اردو بعبارت سہل و دلچسپ متضمن بر طریق زراعت و کشتکاری انگریزی با دیگر فوائد نادرہ کتابی است بس خوب و نسخہ ایست نہایت مرغوب تا ایں زمان ایں چنیں کتاب کسے در ایں فن بایں شیرین بیانی تالیف نکردہ ...." (ص ۵)

دوسرا سرٹیفکٹ اردو میں امان علی خاں لکھنوی کا ہے جن سے مصنف نے کتاب کی زبان و بیان کی اصلاح کی استدعا کی تھی۔ موصوف نے مصنف کو "باغستان اردو کا عندلیب ہزار داستان" قرار دیتے ہوئے لکھا کہ

"اس گلشن جاوید یعنی دولت ہند کو ابجد کے ذریعہ سے دولت جہاں کہنا بجا ہے۔"

دولت ہند اور دولت جہاں کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک مرتبہ قیصر روم نے شاہ جہاں کے لقب پر اعتراض کیا تھا کہ صرف "ہندوستان" کے بادشاہ کے لیے "شاہجہاں" کا لقب اختیار کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ ملک الشعرائے شاہجہانی ابو طالب کلیم نے ایک قصیدہ میں اس لقب کی یوں توجیہ کی ہے

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکے است
شہ را خطاب شاہجہانی مبرہن است

یعنی ہند اور جہاں دونوں لفظ کے عدد ایک ہیں (۵۹) اس لیے شاہ جہاں اور شاہ ہند دونوں کہہ سکتے ہیں۔"

(شعر العجم حصہ سوم ص ۲۱۳ نسخہ مطبوعہ آسی پریس لکھنؤ)

چنانچہ یہاں بھی دولت ہند کو اعداد کی رو سے دولت جہاں کہا گیا ہے۔ دونوں کے عدد ۴۹۹ ہوتے ہیں۔

تیسرے سرٹیفکٹ میں مرقوم ہے کہ ضلع گورکھپور کے حاکم ہنری کارنگر صاحب بہادر نے امراء و رؤسا کا ایک جلسہ طلب کیا جس میں مولوی احمد حسین خاں صاحب بہادر صدر الصدور و مولوی غلام محمد مصطفےٰ خان صاحب بہادر صدر الصدور و مولوی عبد العزیز صاحب بہادر صدر امین و مرزا آغا نواب خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر و منشی خورشید علی خاں صاحب سررشتہ دار

عدالت دیوانی وکلکٹر بہادر شاہی صاحب بہادر و راجہ بکرمی دہ البسنت نائحہ وکیل سرکار و رائے بجیاتہ سنگھ صاحب ولد شیوراج سنگھ صاحب تحصیل داران و فدا حسین خان صاحب زادہ قاضی شہر اور دیگر رؤسا شہر نے شرکت فرمائی اور اس کتاب کو پسند کیا اور اس کی طباعت پر اظہار مسرت کیا۔ سرٹیفکٹ میں مصنف کی محنت وکاوش کو سراہا اور کتاب کے مفید ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کا سن تصنیف دریافت نہ ہو سکا۔ گمان غالب ہے کہ ۱۲۹۱ھ میں یا جلد بعد ہی شائع ہوگئی ہوگی۔ کتاب کی افادیت اور مقبولیت کے پیش نظر اسے دوبارہ (زیر نظر نسخہ) ۱۵ رمضان المبارک ۱۲۹۶ھ مطابق جمعرات ۵۰ جولائی ۱۸۸۱ء کو کانپور سے شائع کیا گیا۔ ترقیمہ کی عبارت سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔

"شکر خدا کا کہ کتاب فوائد انتساب مسمّٰی دولت ہند کہ زراعت کے مقدمہ میں بہت خوب اور نہایت خوش اسلوب ہے۔ جس نے اس کے فوائد پر عمل کیا دولت دنیاوی سے متمتع ہوا حسب خواہش اکثر صاحبوں کے مطابق نسخہ مطبوعہ کلکتہ بے تغیر اور تبدیل عبارت اور محاورات کے بموجب بیچ تاریخ پندرھویں ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۶ھ کے شہر کانپور محلہ پٹکاپور میں بیچ مطبع مصطفائی محمد مصطفٰے خان ولد حاجی محمد روشن خان اسکنہ اللہ فی الجنان کے چھپ کر تیار ہوئی"

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زراعت کی ترقی کا بیان، کاشت کے لیے کارآمد مٹی زمین کی تیاری، آلات زراعت اور ان کا استعمال اور پانی کی ضرورت کے بیان کے بعد مختلف اجناس، پھل پھول، سبزی ترکاری وغیرہ کے پودوں اور درختوں کی کاشت کے طریقے اور ان کی ضروریات کو انگریزی طریقۂ کاشت کے نقطۂ نظر سے مفصل بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے سبب تصنیف میں مذکور ہے کہ "اہل ولایت انگلش کے زراعت کے دستور کو رائج کرنے کے لیے" یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

مختلف اشیاء کی کاشت کے بیان میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کس ملک کا کونسا بیج اچھا ہوتا ہے۔ ہندوستانی اور انگریزی طریقۂ کاشتکاری کا مقابلہ کرکے ہندوستانی طریقے کے نقائص اور انگریزی طریقے کے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔

ایک باب میں مویشیوں کی پرورش کا ذکر ہے جس میں گائے بیل، بھیڑ بکری کی دیکھ بھال، ان کی اچھی نسل حاصل کرنے کے ذریعے بیماریاں اور علاج اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں دودھ سے پنیر بنانے کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس مصور کتاب میں ہندوستانی اور انگریزی آلات زراعت کی شکلیں دی گئی ہیں اور حسب ضرورت بیان کی وضاحت شکلوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔

کتاب "دولت ہند" کی زبان عموماً سادہ اور آسان ہے۔ کہیں کہیں مصنف نے سادگی سے ہٹ کر مقفّی اور مسجّع عبارت کو اپنایا ہے اور رعایت لفظی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کتاب کی ابتدا حمد و ثنا سے ہوتی ہے۔ یہ عبارت مقفّی اور مسجّع ہے اور اس میں رعایت لفظی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

"ابتدا کر بلفظ بسم اللہ سب سے افضل ولا ہے ذکر اللہ"

"گلدستہ حمد بیشمار و دو شاہزار ہزار اس باغبان گلزار ہمیشہ بہار کے واسطے ہے کہ جس نے ابوالبشر کو پہلے جنستان رضوان کے سبزہ زاروں اور رنگین روشوں کو عشرت اور مسرت کی آنکھوں سے دکھایا اور طرہ شکر و سپاس لائق اس آرائش دینے والے حدیقہ گیتی اور تازگی بخشنے والے گلشن ہستی کے ہے جس نے بنی آدم کو مرغزار بہشت سے نکال کر واسطے انتظام کائنات کے پیچھے تخت زمردیں پر خاک کے بٹھا کر زراعت کے آئین کو ان کے پنجۂ اقتدار میں سپرد کیا اور نعت بے پایاں تمامی پیغمبران صلوٰۃ اللہ علیہم کے لیے ہے کہ جن کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے گلشن دہر نے رونق تازہ پائی اور درخت دین و امت کا ہی کے پھولوں سے بارور ہوا۔"

(ص۲)

انگور کے درخت کا بیان انگور کی رعایت سے ذیل کے جملے سے شروع کیا گیا ہے۔

"میخواران مصطبۂ شوق و میگساران خمکدۂ ذوق کیفیت دخت رز کو ایسا بیان کرتے ہیں کہ انگور بہت قسم کا ہوتا ہے پر اصل میں دو قسم اور دو رنگ کے ہوتے ہیں............" (ص۱۱۸)

نیشکر (گنا) کے بیان میں ظہوری کا انداز ملاحظہ کیجیے۔

"شیریں کلامان خوش گفتار و ذائقہ دانان کام و دہان روزگار اس طرح سے عذب البیان ہیں کہ تمام پردہ زمین کے نیشکر سے اس تین دیار یعنی اوٹے ہی پوربن۔ اور چین میں بہتر سب سے اور شیریں اور خوش مزہ اور ملائم اور پاکیزہ اور موٹا اور بڑا نیشکر

ہوتا ہے ...." (ص۳۱)

سادہ اور عام فہم زبان کے چند نمونے ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

پانی کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اہل زراعت انگلستان اپنے ولایت میں ہمیشہ پانی زیادہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں اور برخلاف اس کے یہاں کے اہل زراعت اکثر پانی کے نہیں پانے کا گلہ کیا کرتے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ولایت انگلستان میں دھوپ کی تپش کم ہے اور سردی غالب اس لیے زمین وہاں کی ہمیشہ مرطوب رہتی ہے۔ اور اس دیار میں تابش آفتاب سے گرمی بہ مرتبہ غالب ہے اور سردی مغلوب اس واسطے زمین یہاں کی خشک ہوتی ہے اور پانی درکار ہوتا ہے۔ المختصر شکایت دونوں کی درست ہے لیکن اہل زراعت ولایت اپنے دور اندیشی اور دانائی و محنت و تردد سے اپنی اپنی زمینوں میں سے پانی کے نکالنے کے لیے نہریں بنائی ہیں مگر اس دیار کے لوگ اپنے اپنے کھیتوں میں پانی کے رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے صرف آسمان پر بھروسہ رکھتے ہیں اسی واسطے اس دیار میں کبھی کبھی قحط اور خشک سالی ہوتی ہے..."

(ص۳۳)

چنے کی کاشت کا بیان اس طرح شروع کیا ہے۔

"جس مٹی میں کہ بالوئی رہتی ہے وہ زمین چنے کی زراعت کے لیے بہتر ہے۔ اس کو بوتے ہیں اخیر اکتوبر سے لے کر اول جنوری تک یعنی ابتدائے کاتک سے اوائل پوس تک چنے کی زمین کو چاہیے کہ آٹھ نو انچ گہری کھودی جائے اور وہ لائی مٹی سے خوب ڈھیلے مٹی کے توڑیں ...."

(ص۵۱)

کاشتکاری کے آلات کے بیان میں ہل کے متعلق یوں لکھا ہے۔

"یہاں کا ہل ہل نہیں ایک کھیل ہے اور پھل اس کا پھل نہیں ایک تماشا ہے۔ کس واسطے کہ ایک ٹیڑھی لکڑی میں ایک کھرپی کا پھل لگ رہتا ہے۔ بھلا ایسے ہل اور بیلوں سے کیا زمین جیسی چاہیے ویسی کھودی جاوےگی اور فصل کیا اچھی ہووےگی۔ ایسا ہل صرف اس مقام میں کام آتا ہے کہ جس جا پر زمین کے کم کھودنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دیار کے ہل سے کبھی اس قدر زمین کھودی نہ جاوےگی جب تک کہ وہ لائقی ہل نہ بنے اور آئین کھودنے کا جیسا ولایت میں مروج ہے اس دیار میں رواج نہ پاوے........"

(ص۱۹)

۱۸۵۷ء کے پہلے مختلف علوم و فنون پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے مطبوعہ یا قلمی نسخے تلاش و جستجو سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

مراسلات

عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو، عالم جانکنی میں

دو تین دن قبل وہ بھی اتفاق سے مگر نہایت ہی معتبر ذریعے سے مجھے معلوم ہوا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی بھی درس گاہوں میں ویمنز کالج ہی وہ واحد ادارہ ہے یا تھا جہاں اب تک اردو یا ہندستانی میں بھی انگریزی کے ساتھ ساتھ معاشیات، سیاسیات اور سماجیات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ گویا تمدنی علوم کی متوازی جماعتیں تھیں جن میں انگریزی کے سوا ہندستانی میں درس دیے جاتے تھے۔ گزشتہ سال سے ہندستانی میڈیم میں داخلے قطعی طور پر بند کر دیے گئے اور اب صرف گزشتہ سال کی داخل شدہ لڑکیاں ہیں جنھیں بی۔ اے آخری کی جماعتوں میں ہندستانی میں درس دیے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے، عثمانیہ یونیورسٹی کی حد کی تقریباً ۱۸ درس گاہوں میں سے صرف ایک ویمنز کالج ہے جہاں ہندستانی میں بھی تدریس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، یہ اس تعلیمی سال کے آخر پر یعنی فروری/مارچ ۱۹۷۶ء میں ختم ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ اردو کا خاتمہ بالخیر ہو گا۔

اس حقیقت کے مقابلے میں یہ خبر کتنی دلخشکن ہے کہ اردو کے سچے دوستوں کے مساعی بلیغ سے حیدرآباد کے لیٹر بکسوں پر دو چار ہی نہیں بلکے سب پر "اوقات کشادگی" لکھ دیے گئے ہیں۔ آپ سمجھے بھی کہ یہ "اوقات کشادگی" کیا بلا ہے؟ یہ ایک قابل تحسین کارنامہ ہے جس کا سہرا براہ راست یا بالواسطہ اردو دوستوں کے سر ہے۔ حیدرآباد میں اردو کی ترقی، توسیع اور "کشادگی" کے بارے میں آپ کچھ اور معلوم کرنا چاہتے ہیں تو یہ بھی سنیے چند مہینوں سے بجلی کے بل صرف انگریزی اور تلنگی میں ہوتے ہیں پنشن فارم کی خانہ پوری کرنے کے لیے اردو کا ایک لفظ بھی فارم پر نہیں ہوتا پنشن فارموں سے اردو کو غالباً اس لیے نکال دیا گیا کہ لیٹر بکسوں پر "اوقات کشادگی" لکھے جا رہے ہیں اور ہم اردو داں اس صراحت سے شب و روز مستفید ہو رہا ہے گویا ایک کمی کی تلافی مکمل طور پر کر دی گئی۔ حیدرآباد میں کم و بیش ہزار بسیں چلتی ہیں۔ ان میں جانے آنے کے راستے، منزلوں کے نام، ہدایتیں وغیرہ سب انگریزی اور تلنگی میں ہوتی ہیں۔ پچھلے سال ڈیڑھ سال میں بسوں سے بھی اردو غائب کر دی گئی اور اب اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے آخری کالج میں بستر مرگ پر پڑی ہے۔ مگر حامیان اردو، اردو دوستی "قابل تحسین کارنامے" انجام دینے والے، مقامی اخباروں کے ایڈیٹر، نامہ نگار اور کم سے کم ایک دو ایڈووکیٹ خوش ہیں کہ آندھرا پردیش میں اردو کو دوسری علاقائی زبان کا درجہ دیا جا چکا اور آندھرا پردیش میں اردو دوسری علاقائی زبان ہے۔ یہ خوش فہم افراد خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو ایسا گمراہ کیا کہ آندھرا پردیش کی وسعت نظری، انصاف پسندی، مصلحت شناسی، تدبر وغیرہ کی داد اور تو اور خود صدر انجمن ترقی اردو (ہند) سے ملی اور صاحبان صداقت، اردو ہال کی بلندی و وسعت اور ایوان اردو کی رونق و سجاوٹ دیکھ کر ایسے خیرہ نظر اور رطب اللسان ہوئے کہ بیشتر افراد جو پہلے ہی سے گمراہ تھے، مزید غلط فہمیوں بلکہ مغالطوں اور خوش فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔

(ڈاکٹر جعفر حسن)

نوٹ:۔ اگر یہ صحیح ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کالجوں میں اردو میڈیم میں درس کا سلسلہ اگلے سشن سے ختم ہو جائے گا تو یہ بہت رنج اور افسوس کی بات ہو گی بلکہ اسے ایک قومی حادثہ سمجھنا چاہیے۔ اردو دوستوں کا عموماً اور حیدرآباد کے اردو دوستوں کا خصوصاً فرض ہے کہ اس سلسلے کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھیں۔ اردو میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دی جا چکی ہے اور دی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کم از کم ویمنس کالج میں اردو میڈیم کے کلاس جاری نہ رہیں۔ آندھرا پردیش کی انجمن کو اس معاملے پر فوری توجہ کرنی چاہیے اور اس فیصلے کو بدلوانا چاہیے۔　　(ادارہ ہماری زبان)

صوتیات اور عروض[1]

ہماری زبان کے ۸ ستمبر کے شمارے میں جناب اقبال کرشن صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا جس میں انھوں نے ختائی نون والے بعض الفاظ کے صوتی رکن اور ان کے صحیح اوزان دریافت فرمائے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اس بحث کو پھر چھیڑنا چاہتے ہیں اس لیے کہ "اردو میں الفاظ کے اوزان کا انحصار اردو صوتیات پر ہے۔" ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ بات ویسی ہی غلط ہے جیسے سویں صدی میں کوئی کہے کہ زمین چپٹی ہے۔ اردو میں الفاظ کے اوزان کا انحصار اردو صوتیات پر نہیں، عروض پر ہے۔ عروض کے اصول و قواعد اول اول جس زبان کے لیے وضع ہوئے تھے، یقیناً اس زبان کی صوتیات کی روشنی میں تیار کیے گئے تھے، لیکن اردو میں ان کی حیثیت "بیر تسمہ پا" کی ہے۔ یعنی یہ اصول تیار ہوئے تھے سامی خاندان کی ایک زبان کے لیے اور اس لحاظ سے سائنٹفک ہیں، لیکن بعد میں روایت کے غلبے کی وجہ سے انھیں اردو پر جو ایک بالکل مختلف یعنی ہند آریائی خاندان کی زبان ہے، اس کی صوتی ضرورتوں کا خیال کیے بغیر مسلط کر دیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاً جو چیز سائنٹفک تھی، اردو میں آکر اس درجہ سائنٹفک نہ رہی۔ ماہرین جانتے ہیں کہ عروض کے بعض اصول اردو صوتیات کی روشنی میں صحیح ثابت نہیں ہوئے۔ اردو میں اوزان کی بحث کرتے ہوئے یہ نکتہ خاطر نشان رہنا چاہیے کہ اردو میں اوزان

---

[1] اس مراسلے کے سلسلے میں بعض تکنیکی امور سے متعلق میں نے اپنے کرم فرما جناب رشید حسن خاں صاحب سے مشورہ کیا جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ بہر حال مراسلے میں جو آراء پیش کی گئی ہیں ان کی پوری ذمہ داری مجھ ہی پر عاید ہوتی ہے۔ (ک۔ ج۔ ن)

کا تعلق عروض سے ہے، صوتیات سے نہیں۔

دوسرے یہ بھی واضح رہے کہ عروض میں حرف سے بحث کی جاتی ہے، صوتیات میں آواز سے۔ (اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت اس لیے ہے کہ اردو نامہ میں ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے ماہر لسانیات نے میرے مضمون کے جواب میں جو غیر سائنٹفک باتیں لکھی ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اردو میں روایت کی جکڑ بندیوں کی وجہ سے حرف و صوت کا فرق ذرا مشکل ہی سے ہضم ہوتا ہے) گو عروض میں کہا جاتا ہے کہ "جو حرف پڑھنے میں نہیں آئے گا یعنی جس حرف کی منفرد آواز نہیں، وہ تقطیع میں نہیں آئے گا"۔ یہ ایک لحاظ سے صوت کو بنیاد بنانے والی بات ہے اور اصلاً ایسا ہی تھا، لیکن اردو میں چونکہ بعض مستعار عربی اصوات تبدیل ہو گئی ہیں، عروض میں حرف کو صوت پر حاوی ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ عاشق یا عالم میں ع اور الف کو دو آوازیں مانا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ دو حرف ہیں، حالانکہ صوتیات کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ بول چال کی فطری اردو میں ع منفرد آواز نہیں بلکہ اہل زبان کی اکثریت اسے دوسرے مصوتوں کے ساتھ ضم کر کے ادا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے عاشق یا عالم میں ع اور الف ایک ہی آواز ہیں یعنی [a]۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو، عروض میں آ یعنی مد اور الف دو حروف ہیں، اس لیے دو آوازیں ہیں، حالانکہ دراصل یہ ایک ہی مصوتہ [ā] ہیں۔

تیسرے یہ بات بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ عروض کا تعلق شاعری کی زبان سے ہے جبکہ صوتیات کا بول چال کی فطری زبان سے۔ ادبی شاعری کی زبان ہمیشہ ایک حد تک مصنوعی ہوتی ہے کیونکہ ایک تو وہ روایت کے پہرے میں رہتی ہے، دوسرے وہاں شعری ضرورتوں کے تحت، خصوصاً مصوتوں کے وقفوں (DURATIONS) میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ صوتیات یا عروض سے بحث کرتے ہوئے اگر ایک دوسرے سے حوالہ دیا جائے تو احتیاط لازم ہے، ورنہ یہ راستہ غلط نتائج کی طرف لے جائے گا۔

اقبال کرشن صاحب نے تین طرح کی مثالیں دی ہیں۔

(۱) جنگی، زنگی۔۔۔۔۔۔

(۲) جنگ، رنگ۔۔۔۔۔۔

(۳) بانگ، ٹانگ۔۔۔۔۔۔

ان کا جواب ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) پہلی مثال میں دو صوتی رکن ہیں، {جن} {گی}؛ {زن} {گی}۔ اقبال کرشن صاحب کہتے ہیں: "اس نون کاف... لی ہوئی آواز کو دو صوتیہ کہنا چاہیے، اور یہ دو صوتیہ طور پر ناقابل تقسیم ہے۔" یہاں انھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہماری زبان کے فروری ۱۹۶۵ء کے شماروں میں میرا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس میں میں نے جو سوال اٹھایا تھا، وہ یہ نہیں تھا کہ غنائی نون اور گاف ناقابل تقسیم ہیں، بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ جنگی زنگی وغیرہ لفظوں میں صوتی رکن کی لکیر کہاں کھینچی جائے۔ یعنی اتنی بات تو طے ہے کہ ان الفاظ میں دو صوتی رکن ہیں۔

عروض کی روشنی میں جنگی زنگی کا صحیح وزن فع لن ہی ہے۔

اقبال کرشن صاحب کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ "پہلی مثال کے ۔۔۔۔۔۔۔ الفاظ میں گاف اور کاف مشدد ہیں۔" جنگی زنگی وغیرہ میں تو تشدید کا شائبہ بھی نہیں۔

(۲) جنگ، رنگ وغیرہ یک رکنی الفاظ ہیں۔ عروض میں ان کا صحیح وزن فاع ہے۔ فع کے لیے اصرار کرنے کی ضرورت تب پیش آتی جب اردو میں غنائی نون اور گاف ایک آواز ہوتے۔ البتہ انگریزی میں ایسا ہے یعنی SING دراصل [sɪŋ] ہے۔ اردو میں جنگ کو [ʤəŋg] لکھا جائے گا یعنی غنائی نون اور گاف الگ الگ دو آوازیں ہیں۔

(۳) بانگ ٹانگ کے بارے میں بھی اقبال کرشن صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان میں نون غنہ ہے، غنائی نون نہیں۔ نون غنہ اردو میں مصوتوں کی صفت (FEATURE) ہے۔ عروض کی روشنی میں بھی بانگ ٹانگ کو جنگ رنگ کی طرح سہ حرفی لفظ سمجھا جاتا ہے۔ اور دونوں کا وزن ایک ہے یعنی فاع۔ میرے نزدیک ان مثالوں میں روایتی عروض اور صوتیات میں کوئی اختلاف نہیں۔

گوپی چند نارنگ

حیدرآباد میں اردو کے ہمدردوں اور کارکنوں کا اجتماع

ریاستی شاخ آندھرا کے جنرل سکریٹری حبیب الرحمن صاحب کا گشتی مراسلہ

گذشتہ سال انجمن کے سرپرستوں، ہمدردوں اور کارکنوں کا جو اجتماع منعقد ہوا تھا وہ انجمن کی کارکردگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے جو مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں اس کے پیش نظر اس سال بھی ۱۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ایک ایسا اجتماع منعقد ہوگا تاکہ باہمی مشوروں سے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیا جاسکے۔

یہ اجتماع اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سال اسمبلی میں ایک غیر سرکاری بل تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے جس کا ہم سب دلی خیر مقدم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارا یہ مطالبہ بھی ہے کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے اسے قانونی حیثیت عطا کی جائے یعنی اسے دوسری علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر کے قانونی موقف دیا جائے۔ اس کے علاوہ سال رواں کے دوران میں انجمن کو تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اردو کے تعلق سے حکومت کی معینہ پالیسی پر عمل نہیں ہو رہا ہے جس کی بنا پر انجمن کے دفتر پر سینکڑوں شکایتیں وصول ہوتی رہتی ہیں کہ طلباء کی مطلوبہ تعداد دستیاب ہونے کے باوجود تحتانوی سطح پر بھی اردو جماعتیں کھولنے کا بروقت انتظام نہیں کیا جاتا اور اگر نمائندگیاں کرنے پر جماعتیں کھل بھی جاتی ہیں تو مہینوں اساتذہ کا بندوبست نہیں ہوتا اور سرپرست تنگ آکر بچوں کو مدرسہ سے نکال لیتے ہیں۔ اس طرح سے اردو اساتذہ کی ٹریننگ اور درسی کتابوں کی فراہمی کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں ہے اور یہی حال حکومت کی ان دوسری ہدایات کا ہے جو اردو کے تعلق سے جاری ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس سال پھر سے اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام کے سلسلے میں عطیہ کے جس لزوم کو برخواست کر دیا گیا تھا اسے دوبارہ جاری کیا جا رہا ہے۔ عدالتوں کو بھی یہی حال ہے۔ تلنگانہ میں اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے باوجود اس کو اس حق سے محروم رکھا جا رہا ہے اور بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

ان تمام امور اور خاص طور پر تعلیمی مسائل اور علاقائی زبان کی حیثیت سے اردو کے قانونی موقف کو تسلیم کروانے کے سوال پر رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے اردو کے سرپرستوں، ہمدردوں اور کارکنوں کا ایک اجتماع (کنونشن) اتوار ۱۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کو حیدرآباد میں بلایا گیا ہے تاکہ باہمی تبادلۂ خیال اور مشوروں کی روشنی میں آنے والے تعلیمی سال کے دوران میں حکومت کی معینہ پالیسی اور اس کی اساس پر جاری کردہ ہدایات کی موثر عمل پیروی کی جائے، ہمدردان اردو کو پابند کروایا جاسکے نیز اردو کی قانونی حیثیت کو تسلیم کروانے کے لیے جو اقدام ضروری ہوں ان پر بھی غور کیا جاسکے۔

اگر اس موقع پر اردو بولنے والوں کی طرف سے ضروری جدوجہد جاری نہیں رکھی گئی تو اندیشہ ہے کہ اردو کی قانونی حیثیت تسلیم کروانے کا سوال نیز اس کے تعلیم اور بقاء و تحفظ کے مسائل اور پیچیدہ شکل اختیار کر لیں گے۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس اجتماع میں شرکت فرما کر اردو کے تعلق سے اپنے فرض کو پورا کریں۔ اس سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ حیدرآباد کے باہر سے آنے والے حضرات کے قیام و طعام کا انتظام انجمن کی جانب سے کیا جائے گا۔

اس عام اجتماع سے قبل انجمن کی شاخوں کے صدور اور معتمدین کا ایک خصوصی جلسہ ۱۱ دسمبر کو منعقد ہوگا تاکہ مندرجہ بالا مسائل کے علاوہ انجمن کے تنظیمی مسائل پر بھی تبادلۂ خیال کیا جاسکے۔

اس اجتماع سے قبل انجمن کی شاخوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے یہاں بھی اردو کے کارکنوں کا ایک ایسا نمائندہ اجتماع بلائیں تاکہ اپنے اپنے علاقے کے مسائل کو حیدرآباد میں منعقد ہونے والے مرکزی اجتماع میں پیش کیا جاکر ان کی یکسوئی کے تعلق سے اجتماعی طور پر غور کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں اگر مرکزی انجمن کو قبل از قبل اطلاع دی جائے تو وہ کوشش کرے گی کہ ایسے مقامی اجتماعات میں اپنے کسی نمائندے کو بھیج دے تاکہ مرکزی انجمن کو مقامی مسائل کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ آپ کے فوری جواب کا انتظار رہے گا تاکہ پروگرام کو قطعی شکل دی جاسکے۔

قومی دفاعی فنڈ کے لیے علی گڑھ میں مشاعرہ

علی گڑھ ۳۰ اکتوبر۔ خواتین قومی دفاعی کمیٹی کے زیر اہتمام دفاعی فنڈ کے لیے کینیڈی ہاؤس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرہ کی صدارت اردو کے ایک نامور شاعر جناب آنند نرائن ملا نے کی۔ ملا صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہندوستان پاکستان سے جو جنگ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری اگر ہندوستان پر ہوتی تو میں اس کی مذمت کرتا لیکن اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس جنگ کی ساری ذمہ داری پاکستان پر ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اردو شاعروں اور ادیبوں نے جنگ ہو یا امن ملک و قوم کے

مفاد کا خیال رکھا ہے:

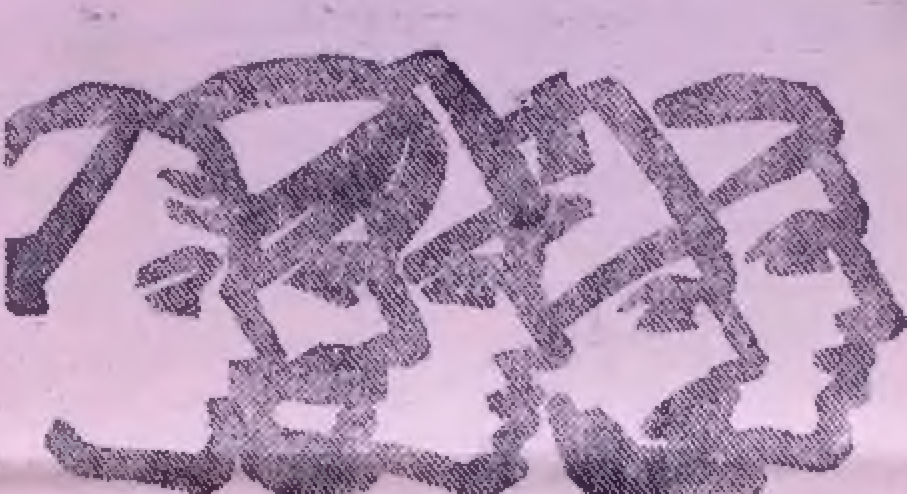
اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعراء میں آنجہانی مخدوم محی الدین، روش صدیقی، علی جواد زیدی، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، پروفیسر آل احمد سرور، اختر انصاری، مسعود علی ذوقی، ڈاکٹر شعیب الرحمن، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، ڈاکٹر رویندر بھرمر، راہی معصوم رضا، سیدہ فرحت، زاہدہ زیدی، شہریار، جعفر مہدی تاباں، صبا جائسی، حفیظ میرٹھی اور امیر عارفی کے نام قابل ذکر ہیں۔

(نامہ نگار)

کروڑی مل کالج میں اردو جاننے والوں کیلئے اردو کلاسوں کا آغاز

دلی ۳۰ اکتوبر کل بزم ادب کروڑی مل کالج دلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام اردو نہ جاننے والے اساتذہ و طلبائے کالج کے لیے اردو کلاسوں کا افتتاح عمل میں لایا گیا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی نے افتتاح فرماتے ہوئے کہا کہ اردو ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت مشترکہ قومی و سماجی روایات اور تہذیبی یکجہتی کا ایک روشن نشان ہے اگر اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے جدوجہد برابر جاری رہی تو یہ قومی اتحاد اور جمہوری قدروں کی بقا کے لیے بہت مبارک ہوگا۔ (الجمعیۃ)



مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا اور پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا۔